کیا ایرانی تشکیلِ نو (پرسٹرائیکا) بنیادی تبدیلیوں کے بغیر ممکن ہے؟*

شیریں ٹی ہنٹر

۱۹۹۷ء میں ایران کے صدارتی انتخاب میں ستر فیصد رائے دہندگان کی حمایت سے حجۃ الاسلام محمد خاتمی کی کامیابی اسلامی انقلاب کے بعد اہم واقعہ تھا۔ خاتمی کی اعتدال پسندی، آزادی اظہار و اختلاف کی حمایت اور انتخابی مہم کے دوران قانون کی حکمرانی قائم کرنے کے وعدوں سے ایران اور اس سے باہر لوگ یہ توقع کر رہے ہیں کہ وہ معاشی اور سماجی اصلاحات نافذ کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

مغربی دنیا سے تعلقات کے حوالے سے بھی خاتمی نے انقلابی افکار سے مختلف مؤقف اپنایا۔ چنانچہ جنوری ۱۹۹۸ء میں سی این این سے ان کے انٹرویو نے امریکی ناظرین کی توجہ حاصل کی۔ اس انٹرویو میں اُنہوں نے امریکی عوام اور ثقافت کی تعریف کرتے ہوئے دبے الفاظ میں ۱۹۷۹ء میں امریکی سفارت خانے پر قبضہ پر معذرت بھی کی۔ امریکہ کے بارے میں اُن کی رائے آیت اللہ خمینی سے کافی مختلف تھی کیونکہ وہ اُسے بڑا ''شیطان'' سمجھتے تھے۔ خاتمی نے امریکی معاشرے اور مذہب و آزادی اور ترقی و روحانیت کے درمیان قائم توازن کی تعریف کرتے ہوئے ایران میں ایسا کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

خاتمی مسلمان ممالک میں مغرب کے بعض معاشرتی اور سیاسی ادارے قائم کرنے کے حق میں ہیں۔ دوسری طرف عالمی اسلامی تحریکیں اور ایران کے مذہبی عناصر سمجھتے ہیں کہ اسلام ایک برتر تہذیب ہے جس میں اخلاقی، سیاسی، سماجی اور معاشی تمام مسائل کا حل موجود ہے اس لیے مسلمانوں کو مغربی سائنس و ٹیکنالوجی سے استفادہ ضرور کرنا چاہیے لیکن انہیں مغربی اداروں کی نقالی سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ایران میں انقلاب کے بعد یہی ہوا کہ شاہ دور کے ہر اُس ادارے کو ختم کر کے اسلامی طرز سے

---

* Shireen T. Hunter, "Is Irani Perstroika Possible without Fundamental Change?", *The Washington Quarterly*, Au tumn 1998, pp. 23 - 41 (تلخیص: ڈاکٹر فخر الاسلام)

تبدیل کیا گیا جس میں مغربی طرز فکر کا شائبہ بھی پایا جاتا تھا۔

مغربی مبصرین خاتمی کے جرات مندانہ مؤقف کو ایرانی پرسٹرائیکا (reconstruction) اور گلاسناست (openness) سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے مطابق ایرانی سیاست کے تناظر میں یہ ایک حیران کن مظہر ہے۔ یہ مبصرین خاتمی سے اپنے پیش رو ہاشمی رفسنجانی سے زیادہ کامیابی کی توقع رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ رفسنجانی ہی تھے جنہوں نے اصلاحات کا آغاز کر دیا تھا انہی کے دور میں دانشوروں اور بعض انقلابی لیڈروں نے خمینی اور ان کے ساتھیوں کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے بعض بنیادی اصلاحات کا مطالبہ کیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا خاتمی واقعتاً کوئی مفید تبدیلی لاسکیں گے؟ اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں رفسنجانی دور پر نظر ڈالنی ہوگی۔ اُنہوں نے اگست ۱۹۸۹ء میں خمینی کے انتقال کے دو ماہ بعد اقتدار سنبھال لیا تھا۔ اُن سے بھی ایرانیوں اور باہر کی دنیا نے کافی توقعات وابستہ کی تھیں یہاں تک کہ اُنہیں ''ایرانی گورباچوف'' کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ تاہم سوویت یونین کے زوال نے ایرانی اصلاح پسندوں کو محتاط کر دیا۔ چنانچہ اسی تناظر میں خاتمی کو بھی محتاط رہنا ہوگا کیونکہ اگرچہ اکثر ایرانی تبدیلی کے حق میں ہیں لیکن تھوڑی سی بے احتیاطی قومی سالمیت اور علاقائی وحدت کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔

- مغربی دنیا سے تعلقات کے حوالے سے بھی خاتمی نے انقلابی افکار سے مختلف مؤقف اپنایا۔
- خاتمی مسلم ممالک میں مغرب کے بعض معاشرتی اور سیاسی ادارے قائم کرنے کے حق میں ہیں۔
- ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں دیگر اصلاح پسندوں کو حصہ لینے کی اجازت دی جاتی تو خاتمی اتنی بڑی اکثریت سے نہ جیتتے۔

خاتمی کے پروگرام کی کامیابی کا جائزہ دو عوامل کو پیش نظر رکھ کر لگایا جا سکتا ہے (الف) ایران کی اسلامی حکومت کا ڈھانچہ اور اس کے اندر موجود تضادات جو اصلاحات کے راستے میں رکاوٹ ہیں (ب) تبدیلی کے نعرے کے محرکات جو ماضی قریب میں اصلاحات کی جزوی کامیابی کا باعث بنے۔

موجودہ اسلامی حکومت کی نظریاتی بنیاد کو ایران کے ۱۹۷۹ء والے آئین کے دیباچے میں واضح کیا گیا ہے کہ حکومت کا کام ایسے حالات پیدا کرنا ہے جس کے تحت اسلام کی آفاقی اقدار پنپ سکیں۔ گویا

مقصد آزادانہ انتخابات اور اظہار رائے کی آزادی نہیں بلکہ یہاں تو آئین اسلام کے علاوہ متبادل نظام کو یکسر ناجائز قرار دے رہا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس سوچ کے حامل افراد کو سیاسی عمل سے روکا بھی گیا ہے۔ ایران کے اس مخصوص نظام میں بحث ومباحثے کی گنجائش ضرور موجود ہے اور ۱۹۸۰ء سے اس میں اضافہ بھی ہوا ہے لیکن ایسا بحث ومباحثہ ایرانی قیادت اور آئین کے خیالات کا تابع ہونا چاہیے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو ۱۹۹۷ء کا صدارتی انتخاب جسے اصلاحات کی فتح قرار دیا جارہا ہے، کچھ اور تصویر پیش کررہا ہے کیونکہ خاتمی موجودہ نظام کے خلاف نہیں تھے بلکہ وہ نظام کا حصہ ہوتے ہوئے اپنی نرم مزاجی، مسکراتے چہرے اور نرم مؤقف کے سبب لوگوں میں مقبول ہوئے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں دیگر اصلاح پسندوں کو حصہ لینے کی اجازت دی جاتی تو خاتمی اتنی بڑی اکثریت سے نہ جیتتے۔

> صدر خاتمی ایران کے سیاسی نظام میں بنیادی تبدیلیاں لاکر ایک نیا نظام متعارف کریں جس میں قوم پرستی اور آزادخیالی کی بھی گنجائش ہو یوں اسلام پسندوں کی اجارہ داری کمزور پڑ جائے گی۔

خاتمی کے پروگرام کی کامیابی سیاسی جماعتوں کے قیام کا راستہ بھی ہموار کرسکتی ہے جس کی ابتدا ہوچکی ہے۔ اس کی تازہ مثال تہران کے میئر غلام حسین کرباشی کی قائم کردہ سیاسی جماعت ہے جو انہوں نے اپنے پیشہ ور ماہرین ساتھیوں پر مشتمل بنائی ہے۔ صدر خاتمی کے خلوصِ نیت کا اندازہ یوں بھی ہوسکتا ہے کہ وہ مہدی بازرگان کی قائم کردہ ''نیشنل فریڈم موومنٹ پارٹی'' کو کام کرنے کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں؟

کیا اسلام میں جمہوریت کی گنجائش ہے؟ مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ ''ہاں'' اسلام جمہوریت کے راستے میں رکاوٹ نہیں بلکہ مسلمان حکمرانوں کا غیر جمہوری رویہ اس کے راستے میں حائل ہے۔ ان حکمرانوں میں اسلام پسند اور سیکولر دونوں شامل ہیں۔ اس کی تازہ ترین مثال ترکی ہے۔ اس حوالے سے صدر خاتمی ایران کے سیاسی نظام میں بنیادی تبدیلیاں لاکر ایک نیا نظام متعارف کریں جس میں قوم پرستی اور آزادخیالی کی بھی گنجائش ہو یوں اسلام پسندوں کی اجارہ داری کمزور پڑ جائے گی۔ لیکن کیا محض قدامت پسندوں پر غلبہ منتہا ومقصود ہے یا عظیم تر اصلاحات پیشِ نظر ہیں؟ اگر مقصد وسیع تر اصلاحات نہیں تو ایران کا مسئلہ جوں کا توں اور لاینحل رہے گا۔

ایرانی آئین کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہاں حاکمیت اعلیٰ عوام کے بجائے خدا کی طرف منسوب ہے۔ خدا اور اس کے قانون کے مقابلہ میں عوام کی حیثیت ثانوی ہے چنانچہ روحانی پیشوا کے تحت علماء اور فقہا کا ایک ادارہ امورِ مملکت کی نگرانی پر مامور ہے جو ولایت فقیہ کے فلسفے کے تحت کام کر رہا ہے۔ روحانی پیشوا کا درجہ منتخب فرد سے برتر ہے، چاہے مؤخرالذکر کو بڑی اکثریت کی حمایت حاصل کیوں نہ ہو۔ روحانی پیشوا ایران کے سیاسی نظام میں فیصلہ کُن حیثیت کے حامل ہیں اور صدر کا کام اُن کے احکامات کو جاری کرنا ہوتا ہے۔ اس حقیقت کا اظہار صدر خاتمی نے سی این این کے ساتھ مذکورہ انٹرویو میں کیا ہے۔

روحانی پیشوا ایران کے سیاسی نظام میں فیصلہ کُن حیثیت کے حامل ہیں اور صدر کا کام اُن کے احکامات کو جاری کرنا ہوتا ہے۔

روحانی پیشوا اور ولایت فقیہ کے جواز اور عدم جواز پر بھی بحث کا آغاز ہو چکا ہے اگرچہ دانشوروں اور مقتدرہ حلقوں کی قابل لحاظ تعداد اسے ختم کرنے کے حق میں ہے لیکن ایسا کرنے سے ایرانی نظام کو جو دھچکا لگے گا اس کے پیش نظر حکمران طبقہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ نتیجتاً یہی عہدہ اصلاحات کے راستے میں دیوار بنا رہے گا۔ یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ ولایت فقیہ کی مخالف مذہبی عناصر کیوں کر رہے ہیں؟ یہ عناصر خالص شیعہ عقائد کی بنیاد پر ایسا کر رہے ہیں جن کے مطابق حضورؐ کے انتقال کے بعد خلافت غصب ہوئی کہ یہ حضرت علیؓ کو نہ دی گئی اس لیے اُس وقت سے لے کر آج تک کوئی بھی حکومت جائز نہیں اور عدم جواز کا یہ سلسلہ بارھویں امام کے ظہور تک جاری رہے گا۔

روحانی پیشوا اور ولایت فقیہ کے جواز اور عدم جواز پر بھی بحث کا آغاز ہو چکا ہے۔

یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ ولایت فقیہ کی مخالف مذہبی عناصر کیوں کر رہے ہیں؟

۱۹۷۹ء میں ایک آئینی ترمیم کے ذریعے جب ولایت فقیہ کی مذہبی حیثیت کو سیاسی حیثیت کے تابع کر دیا گیا تو ان مذہبی عناصر نے اس کا بُرا منایا۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس ادارے کو ختم کر کے مذہبی طبقوں کو غیر سرکاری اور غیر رسمی برتری دلائی جائے جیسا کے ایران میں ہوتا رہا ہے۔ یہ مذہبی عناصر سیاست میں اسلام کے کردار کے مخالف ہیں کیونکہ اس سے نہ صرف روحانی پیلو متاثر ہوگا بلکہ حکومت کی ناکامی اسلام

کی ناکامی سے تعبیر ہوگی جیسا کے سوویت یونین کے زوال کو دُنیا اشتراکیت کی ناکامی قرار دے رہی ہے۔

> انقلابی گارڈ کے سپہ سالار رسید یحییٰ رحیمی نے انقلاب دشمنوں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے اور ان کی زبانیں گدی سے کھینچنے کا اعلان بھی کیا۔

مذہبی اور سیکولر دونوں طبقات کی طرف سے ولایت فقیہ کی مخالفت اس مطالبے کا پیش خیمہ ہے کہ اس کی جگہ ایک منتخب ادارہ وجود میں لایا جائے۔ ایسا کرنے کا مطلب مقتدرہ مذہبی طبقوں کی اجارہ داری کا خاتمہ ہوگا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ مقتدرہ حلقوں کے اندر اصلاحات کے حامی لوگ ولایت فقیہ کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں ماضی قریب میں رفسنجانی اور اب خاتمی روحانی پیشوا آیت اللہ خمینائی پر کھلم کھلا تنقید سے احتراز کرتے چلے آتے ہیں لیکن ان دونوں کے خیالات خمینائی سے متصادم ہیں۔

ایک اور پہلو جو قابل غور ہے وہ یہ کہ صدر خاتمی قانون کی حکمرانی اور ایک مہذب اسلامی معاشرے (Islamic Civil Society) کے قیام کے وعدوں پر منتخب ہو کر آئے ہیں لیکن ایسا تب ممکن ہوگا جب وہ اقتدار پر قابض طبقے کی سوچ میں تبدیلی لانے میں کامیاب ہوں۔ قانون کی حکمرانی کے لیے ضروری ہے کہ معاشرہ اس بات پر متفق ہو کہ قانون کا مآخذ کیا ہو؟ اور اس کے اجراء و تشریح کا اختیار کن افراد یا اداروں کے پاس ہو؟ اب صورت یہ ہے کہ ایرانی آئین خدا کی ذات کو قانون کا مآخذ سمجھتا ہے جس کا اظہار قرآن میں ہوا۔ دوسرا یہ کہ امام خمینی نے کہا تھا کہ اسلامی حکومت کی پارلیمنٹ قانون سازی کی مجاز نہیں بلکہ اس کا کام اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے منصوبہ عمل تیار کرنا ہے۔ اس ضمن میں ایک اور مشکل یہ ہے کہ اسلام اور دورِ جدید کے تعلق اور قوانین کے تعبیر و نفاذ کے حوالے سے مذہبی لوگ اختلافات کا شکار ہیں۔ چنانچہ اس کیفیت میں ضروری ہے کہ اسلامی قوانین کی آزادانہ تعبیر و تشریح ہو۔ تاہم یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ پورے ملک میں اس پر اتفاق رائے ہو جس کا فی الوقت امکان نظر نہیں آتا۔

صدر خاتمی کی طرف سے سیاسی آزادیوں کے اعلانات کے ساتھ ساتھ سخت گیر مؤقف رکھنے والوں کی طرف سے اصلاح پسندوں کے خلاف تنقید میں شدت آ رہی ہے۔ ۲۷ اپریل ۱۹۹۸ء کو انقلابی گارڈ کے سپہ سالار رسید یحییٰ رحیمی نے قم شہر میں بحریہ کے افسران سے خطاب کے دوران وزیر ثقافت عطاء اللہ مہاجرانی پر شدید تنقید کی۔ وزیر ثقافت سے اپنی حالیہ ملاقات کا حوالہ دیتے ہوئے رحیمی نے کہا کہ میں

نے ان پر واضح کیا ہے کہ ان کے خیالات ایرانی سالمیت کے لیے نقصان دہ ہیں۔ رحیمی نے انقلاب دشمنوں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے اور ان کی زبانیں گدی سے کھینچنے کا اعلان بھی کیا۔ اس مثال سے صدر خاتمی کے وعدوں کے ایفا کرنے میں مشکلات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

صدر خاتمی نے مہذب اسلامی معاشرے کی جو اصطلاح استعمال کی ہے اس پر بھی اختلاف اور تذبذب کے سائے پڑے ہوئے ہیں۔ ایک مکتبہ فکر اس سے مراد وہ سیاسی نظام لیتے ہیں جس میں مذہب اور ریاست علیحدہ ہوں گے۔ مختلف الخیال لوگوں کو آزادی ہوگی اور عوامی رائے قوانین کا سرچشمہ ہوگی اس سے لامحالہ سیاسی جماعتوں، انجمنوں، گروہوں اور دیگر تنظیموں کے قیام کا راستہ ہموار ہوگا۔ لیکن دوسرا مکتب فکر اس کے برعکس سوچتا ہے۔ ان کے خیال میں سماجی تنظیمیں اسلامی معاشرے میں موجود ضرور ہوتی ہیں لیکن ان کا کوئی سیاسی کردار نہیں ہوتا جیسا کہ ایران اور دیگر اسلامی ممالک میں مساجد، اوقاف اور تجارتی و پیشہ ورانہ انجمنیں کام کر رہی ہیں۔ خاتمی کی مشکل یہ ہے کہ وہ ان دونوں کا ساتھ نہیں دے پا رہے ہیں۔ البتہ اب تک اس بارے میں وہ اس حد تک کہہ چکے ہیں کہ جس نوعیت کا معاشرہ وہ قائم کرنا چاہتے ہیں وہ مغربی معاشروں سے مختلف ہوگا بلکہ ان اصولوں پر مبنی ہوگا جو پیغمبرؐ نے مدینے میں قائم کیا تھا۔ چونکہ خاتمی اپنے مجوزہ معاشرے کی تفصیلات بیان کرنے سے گریزاں ہیں اس لیے مخالفین اس کو آزاد مغربی فکر کا آئینہ دار قرار دے رہے ہیں۔ مذہبی افراد کے خیال میں سول سوسائٹی کی اصطلاح سے مراد ایسا نظام ہوگا جس میں اقدار کی نگہبانی حکومت کے بجائے عوامی خواہشات کے تابع ہوگی چنانچہ حکومت ہر اس غیر اخلاقی قانون کو نافذ کرنے کی پابند ہوگی جو عوامی مزاج کے مطابق ہو۔ حجۃ الاسلام صادق لاریجانی کے مطابق یہ نظام اسلامی نظریے سے متصادم ہے کیونکہ اسلامی نظام میں اقدار کو عوامی خواہشات کا پابند نہیں بنایا جاسکتا بلکہ مخصوص الٰہی اقدار کی حکمرانی اسلامی معاشرے کی نمایاں خصوصیت ہوتی ہے۔

صدر خاتمی کی کامیابی کے پس منظر میں دو عوامل نے اہم کردار ادا کیا: (الف) ایران کی ناقص خارجہ پالیسی۔ اس پالیسی پر عمل پیرا ہو کر ایرانی قیادت نے ملک کے معاشی، سیاسی اور علاقائی مفادات کو خاصا نقصان پہنچایا۔ اس پالیسی کا ایک نتیجہ ایران عراق جنگ تھی جس نے انقلابی قیادت کو سبق سکھا دیا۔ (ب) ایرانی قیادت نے معاشرتی تبدیلیوں کے ردعمل میں جدیدیت کو رواج دیا۔ ان تبدیلیوں میں

سب سے نمایاں نوجوانوں کی آبادی میں اضافہ تھا۔ نوجوان نسل کے خیالات و ترجیحات خاص طور پر ثقافتی امور پر ان کا موقف پرانی نسل سے مختلف تھا۔ ذیل کی سطور میں ان دو عوامل پر مختصر بحث درج کی جارہی ہے۔

خارجہ پالیسی کے محاذ پر سب سے بڑا واقعہ عراق سے تصادم تھا۔ اس جنگ کی تباہ کاریوں اور مایوس کن نتائج نے ایرانی قیادت کی کوتاہیوں کو طشت از بام کر دیا۔ جنگ کے معاشی نقصانات سے سیاسی نتائج زیادہ خطرناک تھے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ جارحیت کا ارتکاب عراق نے کیا تھا، ایران بین الاقوامی حمایت سے محروم رہا۔ نتیجتاً ایران شرمناک جنگ بندی پر رضامند ہوا جس سے اس کا ایک علاقہ عراق کے قبضہ میں چلا گیا۔ واضح رہے کہ اگست ۱۹۹۰ء میں کویت پر حملے کے وقت عراق نے یہ علاقہ ازخود خالی کر دیا۔ جنگ کے دوران عوام کی بے پناہ قربانیوں کا صلہ اُنہیں مایوسی کی شکل میں ملا۔ اس معرکے سے یہ سبق بھی ملا کہ جدید جنگی ساز و سامان کے مقابلے میں محض قربانی کا جذبہ ہی کافی نہیں اس کے لیے بیرونی امداد بھی ضروری ہے۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا جبکہ ایران ہر بڑی علاقائی اور بین الاقوامی طاقت کو ناراض کر چکا تھا۔

جنگ کی تباہ کاریوں اور مایوس کن نتائج نے ایرانی قیادت کی کوتاہیوں کو طشت از بام کر دیا۔ جنگ کے دوران عوام کی بے پناہ قربانیوں کا صلہ اُنہیں مایوسی کی شکل میں ملا۔

اس جنگ کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ ایران کے عوام کے اپنے مقصد اور اعتماد کو ٹھیس پہنچی وہ یہ سمجھنے لگے کہ صدام حسین اور اس کے حامی خواہ باطل کے علمبردار کیوں نہ ہوں اُن کی سچائی پر غالب آسکتے ہیں۔ ۱۹۸۸ء کے موسم گرما میں ایران کی اہم شخصیات خاص طور پر ایران کے سابق صدر رفسنجانی نے ایران کی نظریاتی بنیادوں پر تنقید شروع کی۔ اُن کا کہنا تھا کہ خارجہ پالیسی چلانے میں قیادت سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ جنگ کے مایوس کن نتائج میں زبردست اضافہ اس وقت ہوا جب بحالی کا کام سست پڑ گیا اور لوگوں کے معیار زندگی میں کوئی خاص بہتری نہیں آئی۔

جہاں تک ثقافتی پہلو کا تعلق ہے اسے بھی ایران عراق جنگ کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ مسلسل آٹھ سال سے ماتم اور جذبہ شہادت کی آبیاری نے عوام کو تھکا دیا تھا وہ خوشی چاہتے تھے جس کے اظہار کے لیے آزادی کی ضرورت تھی۔ یہ جذبات جنگ کے بعد والے عشرے میں اور بھی اُبھرے، غیر ملکی مبصرین

نے اسے خوشحالی کا کلچر یا ''فرھنگ خوشحالی'' کا نام دیا۔ ان جذبات کا اظہار ورلڈ کپ فٹ بال میں شرکت کرنے والی ایرانی ٹیم کے استقبال کے دوران ہوا جب لاکھوں پُر جوش افراد نے ٹیم کو خوش آمدید کہا۔ صدر رفسنجانی نے تبدیلی کی لہر کو محسوس کرتے ہوئے کچھ اقدامات ضرور کیے لیکن یہ اقدامات عوامی خواہشات وتوقعات سے کافی کم تھے۔

جیسا پہلے ذکر ہوا درج بالا دو عوامل نے خاتمی کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا رفسنجانی کے مقابلے میں وہ نئے رجحان کا بہتر ادراک کر سکیں گے؟ کیا وہ شدت پسندوں کی مخالفت مول لے کر شیعہ ازم کی خوشحال تر شکل سامنے لانے میں کامیاب ہوں گے۔ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اسلامی حکومت کی ہئیت اور ملک کی ثقافتی اساس میں بنیادی تبدیلی لانے میں کامیاب ہوں گے۔

یہاں ایرانی نسل کے حوالے سے چند حقائق کا ادراک بھی ضروری ہے۔ موجودہ آبادی کا کم وبیش نصف حصہ انقلاب کے دوران یا تو ابھی پیدا ہوتھا یا بچپنے کی حالت میں تھا۔ اس نسل نے انقلاب سے پہلے کا زمانہ اور بادشاہت کی خامیاں نہیں دیکھیں۔ انہوں نے اگر کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تو وہ جنگ اور محرومیاں تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے سخت مذہبی پابندیوں میں جینا سیکھا۔ یہ نسل کافی باشعور ہے اگر چہ یہ شعور انقلابی حکومت نے پیدا کیا لیکن یہ الگ بات ہے کہ حکمرانوں کی مایوس کن کارکردگی کی وجہ سے اب یہ شعور بغاوت کی صورت اختیار کر رہا ہے اس نسل کو انقلاب کو برآمد کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ ہر سال روزگار کے متلاشی چھ لاکھ جوان روزگار کے مواقع ڈھونڈنے اور ملک کی معاشی ترقی کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔ وہ ملکی معاملات میں رائے دینا اور بین الاقوامی برادری کا حصہ بننا چاہتے ہیں۔

جہاں تک اصلاحات کے مستقبل کا تعلق ہے تو ۱۹۹۰ء کا عشرہ جیسے تیسے گزر گیا اس عرصے میں ایران کے معاشی اور سیاسی حالات دگرگوں رہے۔ ایران شاید اب ایک اور عشرے کے ضیاع کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ امریکہ اور دوسری قوتوں کے لیے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا خاتمی کی اصلاحات کا منصوبہ خارجہ پالیسی میں ڈرامائی تبدیلی کا پیش خیمہ تو نہیں؟ اگر چہ اس سوال کا جواب آسان تو نہیں لیکن سعودی عرب سے ایران کے تعلقات کی بحالی کا عمل اس جانب پیش رفت ضرور ہے۔ ایران چاہتا ہے کہ اپنے جنوبی

ہمسائیوں سے تعلقات بہتر بنا کر اپنی سالمیت کا تحفظ کر سکے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس بدلی ہوئی پالیسی کو روحانی پیشوا کی مکمل حمایت حاصل ہے یہ الگ بات ہے کہ شدت پسند اب تک اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ پالیسی میں اس تبدیلی کا مطلب یہ ہے کہ قومی مفاد کو نظریے ideology پر ترجیح دی جا رہی ہے اسی سوچ کے تحت امریکہ سے تعلقات بحال ہو سکتے ہیں اگرچہ ایسا کرنا آسان نہیں۔

امریکہ کو شاید ایران کی بنیادی تبدیلی سے کوئی دلچسپی نہیں کیونکہ اس کے تعلقات سعودی عرب جیسے ملک سے بھی کافی خوشگوار ہیں، باوجود یہ کہ وہاں اسلامی شریعت نافذ ہے۔ امریکہ اہمیت اس بات کو دے گا کہ ایران اپنی پالیسیاں تبدیل کرے۔ مثلاً یہ کہ وہ لبنان میں حزب اللہ اور دریائے اُردن کے مغربی علاقے میں حماس کی حمایت ترک کر دے تاہم امریکہ کے لیے تشویش ناک امر یہ ہے کہ خارجہ پالیسی کے حوالے سے ایرانی قیادت کے درمیان اختلافات موجود ہیں جو مستقبل قریب میں ختم ہوتے نظر نہیں آتے۔

ریکہ اہمیت اس بات کو دے گا کہ یران اپنی پالیسیاں تبدیل کرے۔ لاً یہ کہ وہ لبنان میں حزب اللہ اور یائے اُردن کے مغربی علاقے ں حماس کی حمایت ترک کر ے۔

درج بالا بحث کا خاتمہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ صدر خاتمی اگر اصلاحات کے نفاذ یعنی قانون کی حکمرانی اور سول سوسائٹی کے قیام میں واقعی سنجیدہ ہیں تو انہیں ایران کے نظام میں بنیادی تبدیلیاں لانی ہوں گی۔ اگر وہ کامیابی کے خواہاں ہیں تو شدت پسندوں سے مقاطعہ کر کے دیگر قوتوں کو سیاست کے دھارے میں لائیں۔ ایسا کرنا یقیناً خطرناک ہوگا جس کے نتیجے میں مکمل محاذ آرائی اور انتشار پیدا ہو سکتے ہیں۔ خاتمی اس وقت تک کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں جب تک اصلاحات کے حامیوں اور شدت پسند عناصر کی کشمکش نقطہ عروج پر نہ پہنچے۔ اُس صورت میں خاتمی یا تو اصلاحات کا مکمل نفاذ کریں یا پھر پسپائی اختیار کریں۔

خاتمی سے بڑی توقع یہی رکھی جا سکتی ہے کہ وہ حکومتی مداخلت اور پابندیوں سے آزاد ایک خوشگوار معاشرتی ماحول، بہتر آزادی اظہار اور آزادانہ زندگی کے قیام کو ممکن بنائیں۔ اگر وہ قدامت پسندوں پر غالب آتے ہیں تو پھر تبدیلی کا عمل کافی سرعت سے آگے بڑھ سکتا ہے۔ دوسری صورت میں

ایران ایک اور انارکی سے دوچار ہوسکتا ہے جو خطے کی سلامتی کے لیے خطرناک ہوگا۔

امریکہ کے حوالے سے گزشتہ عشرے میں یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ایران کو تنہا کرنے سے شدت پسند مضبوط تر ہو گئے ہیں۔ لوگوں کی معاشی تنگدستی نے اعتدال پسندوں کو اظہار رائے کی وکالت سے روک رکھا ہے کیونکہ اُنہیں ڈر ہے کہ اس صورت میں تشدد بھڑک سکتا ہے اور ۱۹۹۰ء میں ایسا ایران کے بڑے شہروں بالخصوص مشہد میں ہوا بھی۔ لہٰذا امریکہ کو چاہیے کہ ایران کو ہر لحاظ سے اور خاص طور پر معاشی لحاظ سے تنہا کرنے کی پالیسی پر نظرثانی کرے۔ ایران کی بہتر معاشی صورت حال خاتمی کا کام آسان بنا سکتی ہے صرف اسی صورت میں انتشار کے خوف سے آزاد ہو کر شدت پسندوں پر قابو پا سکتے ہیں۔ شدت پسندوں کا اثر کم ہو تب ہی خاتمی ٹھوس اقدامات کے ذریعے امریکہ کے خدشات دور کر سکتا ہے بلکہ وقت آنے پر امریکہ سے مذاکرات پر بھی آمادہ ہو سکتا ہے۔

[شیریں تی هنٹر سنٹر فار سٹرتیجك اینڈ انٹرنیشنل اسٹڈیز (CSIS) واشنگٹن میں شعبہ مطالعات اسلامی کی ڈائریکٹر ہیں۔ ان کی تازہ ترین کتاب "اسلام اور مغرب کا مستقبل: تہذیبوں کا ٹکراؤ یا پُرامن بقائے باھمی" (The Fature of Islam and the West: Clash of Civilizations or Peaceful Coexistance?) ۱۹۹۸ء کی ابتدا میں شائع ہوئی ہے۔]